سرشت کے تابع

اکرام اللہ

Abstract

The Cultural manifestations of humans has had a significant impact on the development of human beings. Nature became increasingly important as we moved away from it. The article, given below, determines the changes it brought in the production of literature.

جب کبھی زمانے کا نام کان میں پڑتا ہے تو تین چیزیں کسی بھولی بات کی طرح جھٹ سے میری یاد داشت میں تیر سی جاتی ہیں۔ایک تو پارہ اپنی کل وقتی بے چینی اور اضطرار پہلو میں سنبھالے پریشان حال اور چاول کی پرالی جیسے بکھرے بال لیے سامنے کھڑا دکھتا ہے۔میں اس سے پوچھا کرتا ہوں کہ ''کیا اضطراب کے سوا تیری زندگی میں اور کچھ نہیں ہے'' وہ بولا ''کیا کروں مجھے تو ایک ثانیے کے لیے بھی بے قراری سے فرصت نہیں۔اگر کچھ اور بھی میرے فرائض میں شامل کر دیا جائے تو میں کیونکر سارا بکھیڑا سنبھال پاؤں گا۔آپ تو جانتے ہیں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر دوڑتے رہنا میری فطرت ہے۔اک ذرا سے ہچکولے سے بکھر کر ذرّے ذرّے میں بٹ جاتا ہوں۔مجھے پھر سے اک اک ذرّے کو مجتمع کرتے ہوئے اپنی تکمیل کرنا ہوتی ہے۔میں دھات ہوتے ہوئے مائع بھی ہوں اور میرا تمام تر زور اپنے آپ کو اپنے میں ڈوب جانے سے بچانے کی کوشش میں صرف ہو جاتا ہے''۔دوسرا گرگٹ ہے۔میں اس سے پوچھا کرتا ہوں ''تیرا کوئی اپنا اور اصلی رنگ بھی تو ہوگا۔وہ تو ہمیں کبھی نہیں دکھاتا۔'' ''یہ سب رنگ میرے اپنے اور اصلی ہیں البتہ ان کی نمائش کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔میں اس بارے میں مختار نہیں یہ میری سرشت کے اختیار میں ہے''۔

تیسرا اونٹ ہے۔اس کی سینکڑوں کلیں ہیں اور سیدھی ایک بھی نہیں۔میں اسے دیانتداری سے مشورہ دیا کرتا ہوں کہ ''تمھیں ایک آدھی کل تو سیدھی کرا لینی چاہیے۔آج کل ایسے ایسے ڈاکٹر پڑے ہیں کہ پیدائشی کبڑے کے آپریشن سے ایسا کبّ نکالتے ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے سو فی صد درست ہو جاتا ہے''۔اونٹ بڑے دکھ بھرے انداز میں گویا ہوا کہ ''جناب! آپ مجھے اس جھنجھٹ میں نہ پھنسائیں۔ڈاکٹر تو ان دنوں صرف اپنا چہرہ کرانے کے تین ہزار روپے نقد پہلے دھرا لیتے ہیں۔ڈاکٹروں کا یہ عالم ہے کہ یوسفی صاحب جیسے ثقہ بزرگوں تک کے کپڑے اتروانے میں ذرا نہیں ہچکچاتے۔میں تو ایک حقیر، پر تقصیر عاجز اونٹ ہوں وہ میرا کیا حشر کریں گے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔میرے ہسپتال کا قیام، آپریشن کی فیس اور دوائیوں کے اخراجات ملا کر بات لاکھوں تک پہنچ جائے گی۔فرض

کیجیے کے اگر ایک کل سیدھی ہو بھی گئی تو مجھے اور دوسروں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اگر اپنا کوہان سیدھا کرا بھی لوں تو بجائے فائدے کے الٹا خسارہ ہوگا۔ صرف میرا نہیں میرے بہی خواہ بھی محفوظ نہ رہیں گے۔ کوہان نہ ہوگا تو میری کھلی کمر پر سوار محفوظ نہ ہوگا۔ وہ آٹھ نو فٹ کی بلندی سے گرے گا تو سخت چوٹ آنے کا امکان بھی رہے گا۔ جب کوہان نہیں ہوگا تو میری پشت پر لیلیٰ کا محمل کیونکر جم سکے گا۔ لیلیٰ کی تاک جھانک گئی۔ جہاں عشاق کی دید بازی گئی بیقراری بھی گئی۔ لیلیٰ کی معشوقیت کا عہد اپنے انجام کو پہنچے گا۔ آخر ایک روز اسے ختم تو ہونا تھا۔ لیکن زمانوں سے محمل لیلیٰ کے حوالے سے میرا ایک روحانی وقار بنا آرہا تھا وہ خاک بہ سر ہو جائے گا۔ عاشقی کا مذہب صحرا کے سراب میں دریا برد ہو گا۔ نہیں صاحب آپ کا مشورہ میرے لیے نا قابل قبول ہے''۔ ''چلو! تمہاری مرضی''۔ لفظ زمانی کی شنید سے اس کی خصائص کے تین نمائندہ استعارے ذہن میں ہمیشہ کی طرح ابھرے پھر تحلیل ہو گئے۔

ایک زمانہ کتنا طویل ہوسکتا ہے؟ اس بارے میں کوئی پہلے سے نہیں کہہ سکتا یہ تو جب وہ ختم ہوگا تب یقین سے بتایا جا سکے گا۔ مثلاً دراوڑی عہد جس میں موہنجوداڑو، ہڑپہ، کوٹ دجی اور وادیٔ سندھ کے بہت سے دیگر قصبات اور شہر حفظان صحت کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے۔ پکی گلیاں، پکی نالیاں، مکانات پکی مٹی کی اینٹوں سے بنائی گئی دیگر عوامی عمارات مثل غلّے کے گودام، پنچائت گھر، اجتماع کے لئے ہال اسی اینٹ سے تعمیر ہوئے۔ زمین کی زرخیزی کے لئے زرخیزی کی دیوی کے بہت سے مختلف سائز اور حجم کے بت بنا، آگ میں پکا کھیتوں کی مٹی میں انہیں بکھیر دیتے۔ آخر کو انسان تھے۔ تواہمات سے کب تک ذہن کو بچا کے رکھ سکتے تھے۔ محض عقل کے جلو میں چلتے رہنا اور فہم وادراک پر کلی انحصار کرنا مشکل پڑتا ہے۔ اُن کا نظام مادری تھا۔ دیویاں با اختیار تھیں دیوتا غالبًا تھے ہی نہیں۔ مردوں کی حیثیت ثانوی تھی۔ مغربی دنیا نے ہندوستان کے باسیوں کو زندگی کی چار نہایت اہم چیزوں کا موجد تسلیم کیا ہے۔ صنعت میں پہیہ، حساب میں صفر، کھیل میں شطرنج اور زبان دانی میں گرامر۔ اس کے بعد ایسے اٹکے ہیں کہ آج تک وہیں اٹکے کھڑے ہیں۔ پہیہ بنایا اور بیل گاڑی میں لگا لیا وہ چل پڑی اور آج تک چل رہی ہے۔ بھلے مانس اس میں انجن ہی لگا لو۔ اگر آپ نے انجن لگا لیا تو گویا اپنے بزرگوں پر نکتہ چینی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان کے عیب کی طرف دوسروں کی رہنمائی کر رہے ہیں جو ہرگز اچھی بات نہیں۔ پانچ ہزار برس گزر گئے مگر ہل نہیں بدلا گیا۔ انگریزوں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے رائج کیا۔ کچی مٹی کے گھر بناتے ہیں جو ہر برسات میں ڈھے جاتے ہیں۔ اینٹ پکانے میں محنت پڑتی ہے۔ بھنگ پیو، افیون کھاؤ، محلوں میں سونے کے خواب دیکھو موت آئے تو پیوندِ خاک ہو جاؤ جبکہ وہ بڑی حد تک پہلے ہی خاک میں لوٹتے ہوئے پیوندِ خاک بن رہے ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ آج تک چل رہا ہے۔ گھوڑے پر چڑھے آریہ آئے۔ یہاں والوں نے پہلے گھوڑا نہیں دیکھا تھا۔ فولاد بنانے کی صنعت بھی اپنے ساتھ لائے پھر وہیں رک گئے اس سے آگے نہیں بڑھے۔ کپڑا بن لیتے تھے۔ سونے چاندی کے زیورات بنا لیتے تھے مگر سوئی بنانا نہیں آتی تھی۔ ہندوستان کے رہنے والوں نے سوئی جب مسلمان آئے پہلی بار دیکھی وہ ان کے ساتھ ہندوستان پہنچی تھی زن ومرد کپڑا اَن سلا پہنتے جیسے دھوتی، ساڑھی، چادر

وغیرہ۔

زمانے کو وقت ناپنے کے معیار سے اگر ناپیں گے تو نتیجہ صحیح نہیں ہوگا۔ نیا زمانہ پرانے زمانے کی موجودگی میں ہی آن گھستا ہے۔ جیسے وادیٔ سندھ کی پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب کا عہد ابھی بھی بڑی حد تک چل رہا ہے۔ ایک ہی خطۂ ارض پر مختلف ادوار چل رہے ہوتے ہیں، شاید تیسری دنیا کے ممالک میں ان کی پسماندگی کی سطح کے مطابق بہ یک وقت ادوار کی تعداد کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اندر امیر غریب، ان پڑھ اور خواندہ، زن و مرد سب کے لئے ایک ہی زمانہ چل رہا ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کی مجموعی صورت حال جانچنے پرکھنے کے لئے پس ماندہ اور ترقی یافتہ اقوام کی صورت حال کی اوسط دیکھنا پڑے گی۔ زیادہ پس ماندہ اقوام وقت کے تقاضے کے مطابق دیگر اقوام کے ساتھ اپنی سست روی کے باعث قدم ملا کر نہ چل سکیں تو بچھڑ جاتی ہیں، گر جاتی ہیں۔ انسانوں کا ہجوم ان کی زندگیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہیں روندتے ہوئے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ فطرت کا یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے۔ اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟

دنیا میں شب و روز کے اوقات، موسموں کی تبدیلی ان کے ساتھ مربوط تبدیلی کا نظام قدرت کی جانب سے متعین اور مقرر چلا آ رہا ہے۔ یہ نظام قدرت کے اغلاط سے پاک Chronomter کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ انسانوں کے مختلف تہذیبی، معاشرتی، سماجی، سیاسی، علمی، صنعتی ادوار انسانوں سے متعلق ہوتے ہیں اور دیگر مخلوقات سے ان کا بلا واسطہ تعلق بڑی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اس لئے ادوار کی تبدیلی مختلف ممالک کے بسنے والوں کے اپنے ملک کی حد تک انہی کے اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ہر ملک کے بسنے والے اپنی اوسط ذہنی استعداد جس سطح تک وہ پہنچ چکی ہے اس کے مطابق اپنے ادوار میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یورپ تواہمات کے اندھیروں میں بھٹکتا پھرا۔ نئی سائنسی انکشافات کا نتیجہ تھا کہ یورپ ان دنوں نشاۃ الثانیہ (RENAISSANCE) کے دور میں داخل ہوسکا۔ چرچ (اور پوپ) کے وسیع اختیارات کا آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ روم میں دور دراز علاقوں میں واقع چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں تعینات پادریوں کو خاصے اور مؤثر اختیارات حاصل تھے۔ پوپ کا حکم سن کر بڑے بڑے طاقتور شہنشاہ تھرّا اُٹھتے تھے۔ نشاۃ الثانیہ کے ورود کے ساتھ مارٹن لوتھر کے لئے اپنی بات کہنا اور پروٹسٹنٹ (جس کا وہ موجد تھا) فرقے کے اصلاح پسند خیالات کا پرچار ہونے لگا اور (REFORMATION) اصلاح مذہب (عیسائیت) کا دور شروع ہو گیا اور اس طرح بااثر صنعتی انقلاب INDUSTRIAL REVOLUTION کا آغاز ممکن ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ انقلاب کی سرشت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ جب بھی آتے ہیں تو اپنے جلو میں قتل و غارت گری ساتھ لے کے آتے ہیں۔ لیکن جب دنیا کا عظیم ترین انقلاب بپا ہونے لگا اس نے دنیا بدل کے رکھ دی اس کے بعد دنیا وہ نہ رہی جو ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس میں نہ تو ایک قطرہ خون بہا نہ کسی عمارت کی کوئی ایک اینٹ اپنی جگہ سے کھسکی۔ انقلابات جب دھوم دھڑکّے اور فاتحین کے طور طریقے لئے وارد ہوتے ہیں تو وہ ان اصولوں اور تقاضوں کو جو انقلاب شروع ہونے کی بنیادی وجوہات ہوتی ہیں

انہیں بھلا دیتے ہیں اور انقلاب اپنی جون بدل لیتا ہے۔ انقلاب فرانس بادشاہت کے خلاف شروع ہوا تھا۔ لاکھوں کی جہد مسلسل، ہزاروں انسانوں کے خون بہانے پر اور شاہی جوڑے کے دوسروں کا صدقہ پیش کرنے کے بعد جب انقلاب کی دھول چھٹی تو پتہ چلا کہ نپولین اس میں سے شہنشاہ بن کے برآمد ہوا ہے۔ انقلابیوں نے اور رعایا نے شہنشاہیت کو قبول کر لیا۔ لیکن اس کے برخلاف انگلستان سے شروع ہونے والا صنعتی انقلاب بہت مضبوط اور مستحکم بنیاد رکھتا تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کا تقریباً وسط تھا جب یہ انقلاب شروع ہوا اور یورپ، امریکہ اور دنیا کے دیگر صنعتی ممالک میں تیزی سے جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔ نئے دور کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک کے اہالیان کی ذہنی سطح اس درجے تک بلند ہو چکی ہو کہ دوسروں کے الگ مذاہب کی پیروی کرنے اور مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے کی ان میں مکمل برداشت پیدا ہو چکی ہو۔ ملک کے تمام اہالیان کے مابین اور حکومت کے درمیان مذہب، رنگ، جنس، ذات، دولت، سیاسی اقتدار و اختیار کی بنیاد پر کسی طرح کا امتیازی سلوک روا نہ ہوگا۔ تمام شہری برابری کا درجہ رکھتے ہونگے۔ اگر کسی کے اہالیان ایسا کرنے کی صلاحیت اور اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتے تو اس ملک میں عہدِ نو کے متعارف ہونے کے امکانات نہیں۔ وہ اسی فرسودہ، ازکار رفتہ نظام حیات کی قید میں رہیں گے جب تک کہ وہ دوسروں کو آزادی اور برابری دینے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

دنیا میں جو جاندار محض سرشت کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں انہیں تو چھوٹ ہے لیکن انسان کو ہر چیز خاص طور پر جہاں وہ فطرت کے توازن میں دخل اندازی کرتا ہے تو اس کی پوری قیمت آخری پیسے تک ادا کرنی ہوتی ہے۔ بیشتر اوقات اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ اس کی ذہانت کے اجر میں مفت ہے۔ جب دفعتاً خبر ملتی ہے کہ ادائیگی کاٹ لی گئی ہے تو ششدر رہ جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب ہر علم، ہر سائنس، ہر صنعت میں نئی ایجادات کے بل پر ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر کرتا چلا گیا ہے۔ ڈیڑھ سو سالوں میں اگر ترقی کی پرانی چلی آتی رفتار کی شرح پر شمار کیا جاتا تو میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس میں جو ترقی ہونا ممکن تھی وہ اس تھوڑے سے وقت میں ہو چکی۔ لیکن اس ترقی کے ساتھ اخلاقی ذمہ داریوں، احتیاطوں، حفاظتی تدابیر اور پیش بندیوں کی ضرورتیں آن وارد ہوئی تھیں ان کی انسان کو ذرہ برابر اطلاع نہ تھی۔ نہ شعور تھا نہ کوئی فکر تھی۔ وہ نئی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر غافل تھا۔ یورپ کے اندر علاقائی چپقلش ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں وہ ایک نئے فاتح کے انداز اور شوکت لئے ابھرا۔ شعلۂ مستعجل بود ۱۸۰۴ء میں فرانس کا شہنشاہ بنا، انگریزوں سے شکست کھا کے قید رہا اور ۱۸۲۱ء میں مر گیا۔

برق رفتار ترقی کا بل انسان نے پہلی اور دوسری عالمی اور عظیم جنگوں کی شکل میں اور انسانی اموات اور عمارات کی تباہی کی صورت میں دیا۔ کرۂ ارض پر پہلے کبھی اتنی تباہ کن اور انسانیت کے لئے مہلک جنگیں وقوع پذیر نہ ہوئی تھیں۔ پہلی جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی اور ایک کروڑ اسی لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دوسری جنگ ۱۹۳۹ سے شروع ہو کر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی اور چھ کروڑ چونسٹھ لاکھ انسانوں کو زندگی سے محروم کرنے کا باعث بنی۔ تیز رفتار ترقی کے نتیجہ میں کم وبیش کرۂ ارض کے ہر باسی نے مفاد اٹھایا تھا۔ دونوں جنگوں میں

صاحب اختیار لیڈران نئی دریافتوں کی وجہ سے بدلے ہوئے حالات کا صحیح شعور نہ رکھتے تھے۔ دریافتوں کے سماجی، معاشرتی اور دیرپا سیاسی نیز ماحول پر اثرات کیا ہو سکتے ہیں ان سے بے خبر تھے۔ ہر قسم کے نتائج سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے ان کی نظر محض دشمن کو نیچا دکھانے اور اپنی فتح پر مرکوز تھی۔ اس گھٹیا انا پرستی اور وقتی شان اور تفاخر کی قربان گاہ پر جرمانے میں اور تیز رفتار ترقی کی قیمت کے طور پر آٹھ کروڑ چوالیس لاکھ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے ہر طرح کے لطفوں بالخصوص 'ہونے' (BEING) کا احساس جو پوری بے شعور (مکینیکل mechanical) مشینی کائنات میں صرف انسان کو پورا تفویض ہوا ہے باقی جاندروں کو بھی اگرچہ دیا گیا ہے مگر کم کم اسی کو چھین کر انھیں موت کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔ یہ قہر ہے، اندھیر ہے، ظلم ہے۔

تقسیم ہند کے خواب کی تعبیریں تو بہت ہوتی رہیں لیکن تقسیم کا ظلم درحقیقت صرف پنجاب اور بنگال کے لیے روا رکھا گیا۔ بنگال میں ہندو مسلم آبادی کا تبادلہ بھی تھوڑا بہت ہوا لیکن غلط مذہب والے جس طرح پنجاب میں سو فی صد انخلاء کرتے ہوئے پنجاب کے دونوں حصوں میں اپنے اپنے صحیح مذہب والے بھائیوں سے جا ملے۔ اتنی بڑی آبادی کا تبادلہ بنگال میں بھی نہیں ہوا۔ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں مقیم رہی۔ سندھ اور بلوچستان سے اب تک وقفے وقفے سے خبریں آتی رہتی ہیں کہ ہندو وہاں پر غیر محفوظ ہیں اور پناہ کے لیے ہندوستان جا رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے اردگرد کے زمانوں میں جو مذہبی جنون اور ذہنی ہیجان کا عالم طاری ہوا تھا وہ ابتدائی ایک آدھ برس تک چل کر ختم ہو گیا تھا۔ اب مقامی لوگوں کی حرص و ہوا پر مبنی یہ مجرمانہ کوشش ہے کہ ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کے ان کی عورتیں چھین لیں اور انہیں ترک سکونت پر مجبور کر دیں تاکہ ان کی زرعی اراضیات اور مکانات پر قبضہ جما سکیں۔ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو بٹوارہ ہوا، پاکستان بنا اور پاکستان کا جزو بننے والے علاقے انگریز کے تصرف سے نکل کر آزاد پاکستان کہلائے اور پندرہ اگست کو باقی بچا ہندوستان بھی آزاد ہو گیا۔ پنجاب میں جرنیلی سڑک کے شمال مغرب اور بنگال میں جنوب مشرق کے رخ ٹرک، بس، بیل گاڑیاں سامان سے لدی، کچھ مسافروں سے بھری اپنے اداس چہروں اور بھیگی آنکھوں والے زخمیوں کو ساتھ لئے ایک ہجوم کی صورت محو سفر تھے۔ ہر چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ دکھیاروں کا ہجوم پورے ماحول کو ویران کئے ہوئے ہے۔ جرنیلی سڑک پنجاب اور بنگال میں جگہ جگہ بٹوارے کا چلتا پھرتا میوزیم بنی دِکھ رہی تھی۔ پنجابیوں نے اپنے بے ڈھنگے پن میں یہ آزادی کا جلوس عجب مضحکہ خیز انداز اور نرالے بہروپ میں ایک دوسرے کے لئے خود ترتیب دے رکھا تھا۔

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۹۴۵ء میں ہوئے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر مسلم ٹکٹ کسی کھمبے کو دے دیا تو وہ بھی جیت گیا۔ جب متروکہ املاک کی الاٹمنٹ کا وقت آیا تو کھلا کہ سب ٹکٹ یافتگان دراصل تھے ہی کھمبے۔ کھمبوں کا نہ دل ہوتا ہے نہ دماغ۔ انارکلی بازار لاہور میں دوکانوں کی گنتی ان دنوں بھی چند ہزار بنتی ہو گی۔ ان میں مسلمانوں کی صرف دو دوکانیں تھی۔ ایک شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز تھی اور دوسری کرنال بوٹ شاپ نام رکھتی تھی۔ اس بازار میں لے دے کے مسلمانوں کا ایک اور تجارتی نشان نہایت متوسط درجے کا ہوٹل بنام دلی مسلم ہوٹل

بھی تھا۔ پنجاب کے مصروف ترین بازار میں مسلمانوں کی نمائندگی بس اتنی ہی تھی۔ پنجاب کے تمام شہروں اور قصبات میں دوکانوں کی ملکیت میں مسلمانوں کی شرح وہی انارکلی والی ہی تھی۔ایک صاحب کا تخمینہ تھا کہ مسلمان جس کل مالیت کے مکانات مشرقی پنجاب میں چھوڑ کے آئے ہیں اس کے مقابلے میں صرف لاہور کے اندر ہندوؤں کی تعمیرات میں ان پکی اینٹوں کی قیمت شمار کرلیں جو لگی ہوئی ہیں تو وہ مسلمانوں کے مکانات کی کل مالیت سے کئی گنا زیادہ بنے گی۔

جنوبی پنجاب میں پتوکی سے صادق آباد تک سینکڑوں کی تعداد میں کاٹن جننگ فیکٹریز تھیں اوران سے بھی تعداد میں زیادہ بنولے کا تیل نکالنے والی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔صوبائی اسمبلی کے رکن جو مہاجر ہوکرآئے تھے وہ ایک کارخانہ الاٹ کراتے اس کے گوداموں میں بھرا خام اور تیار مال بیچتے اوراگلے شہر میں نیا کارخانہ الاٹ کرا لیتے۔اس کے بھرے گوداموں سے وہی سلوک کرتے۔کروڑوں روپے بنالئے اور رہے پھر بھی وہی کنگلے کے کنگلے۔اتنی بہت سی لوٹی ہوئی دولت کیا ہوئی؟ روایتی جواب ہوتا تیز طرار عورتوں اورسست قدم گھوڑوں کی نذر ہوگئی۔

اس مادی دنیا میں کچھ مفت نہیں ملتا ہر چیز کی قیمت دینا پڑتی ہے، نا اہلی، نالائقی، آوارگی کوفطرت عیاشی کے زمرے میں رکھ کر قیمت طے کرتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ قیمت روپے پیسے میں نہ لے اورعزت، وقار،خودداری، ضمیر کا دیوالہ کی صورت یا نفسیاتی، ذہنی، جسمانی بیماریاں دے کر وصول کرے۔فطرت قیمت وصول کئے بغیر نہیں رہتی۔اگرآج نہیں تو کل، باپ سے نہیں تو بیٹے سے،آئندہ نسلوں سے وصول کرکے رہے گی۔قدرت کے کارخانے میں معافی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

کسی نے کہا ’’الاٹیوں کے منہ چھوٹے تھے اور لقمے بڑے بڑے ٹھونس لئے۔اب نگلے نہیں جا رہے۔ نتھنوں اورمونہوں سے اُبلے پڑ رہے ہیں۔سردیاں آگئی ہیں۔کوٹھیوں میں بجلی کے پنکھے بند کرنے آتے نہیں۔ ڈانگیں پھنسا کے بند کئے ہوئے ہیں‘‘۔

کہاں چھوٹے تھے یار! عام سے منہ تھے۔بس ہندوؤں کی چھوڑی بڑی جائیدادوں کے سامنے چھوٹے لگنے لگے۔

وہ تین چار برس تک لگ لپٹ کے چرتے رہیں پھر پچاس، ساٹھ برسوں تک چپ چاپ بیٹھے جگالی کرتے رہیں تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

انسان کو جگالی کرنی کہاں آتی ہے؟

بچے! ضرورت سب سکھا دیتی ہے۔جو نہیں سیکھتے فطرت انہیں حرف غلط سمجھتے ہوئے مٹا دیتی ہے۔

آج کل دعائیں ہورہی ہیں،منتیں مانی جارہی ہیں کہ منہ بڑے ہوجائیں۔

لگتا ہے جب تک دعا کی قبولیت کا وقت آئے گا کھانے کو کچھ نہیں بچا ہوگا

ایسا ہی ہوا۔منہ تو غار بن گیا۔کہیں ایک کیل تک نظر نہیں آرہی کہ کبھی اُڑ کے منہ میں آن پڑے گی

دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف مونہوں کے دھانے یوں کھلے ہیں گویا غاروں کے دروازے وا ہو گئے ہیں۔انہیں بھرنے کے لئے رشوت کے بازار گرم ہیں۔کوئی جرم ایسا نہیں جو انسان سوچ سکیں اور واقعی یہاں ہو نہ رہا ہو۔بچوں کے سکول کھولنا اور بیماروں کے لئے ہسپتال بنانا محض زیادہ اور جلد روپیہ بنانے کے ذریعے ہیں علم کے فروغ کے نہیں۔

مہاجروں کی آبادکاری کے لئے پہلے دوکانوں اور مکانوں کی الاٹ منٹوں کا مرحلہ شروع ہوا پھر کاشت کاروں کو فی خاندان پانچ ایکڑ زرعی زمین کی عارضی الاٹمنٹ کا سلسلہ چلا۔زرعی اراضی کے کلیموں کی تصدیق ہونے لگی پھر پکی الاٹمنٹ چل پڑی۔مکانوں کے کلیم تصدیق ہونے لگے۔شہری مکانوں کی پکی الاٹمنٹ آ گئی۔ہر مرحلے پر پسماندہ گھاٹے میں رہے۔چالاک،مکاران کے کلیم اونے پونے لے کر لاکھوں بناتے پھر اپنے چھوٹے منہ اور بہ افراط بکھری دولت کا رونا رونے لگتے۔غرض وسط اگست ۱۹۴۷ء سے جو غیر مسلم تارکین کی متروکہ غیر منقولہ جائیدادوں کی تقسیم اور مہاجرین کی حق رسی کے مسائل جو عدالتوں میں پہنچے ہیں تو پچیس برس گزر گئے اور ابھی چل رہے تھے ہزاروں آدمی ان محکموں میں کام کر رہے تھے۔خصوصی عدالتیں،وکلا کی لمبی گنتی،نفسا نفسی کا عالم تھا۔رشوت ستانی کا اندھیر مچ رہا تھا۔ہر کسی کا صرف بے ایمانی پر ایمان تھا۔قدم قدم پر جھوٹ۔مکر،فریب معمولات زندگی تھے۔وہ مہاجر جنہیں تجارت کا معمولی تجربہ تھا جیسے کوئی مشرقی پنجاب میں آٹا،نمک،پھل بیچتا تھا یا سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا ان میں سے چند ایک ہشیار صنعت کار بھی بنے۔اگرچہ ہر مہاجر کو کچھ نہ کچھ ملا لیکن بے اطمینانی انتہا کی تھی۔وہ نہیں جانتے تھے کہ دیانت،اصول،استحقاق کن بلاؤں کے نام ہیں۔زیادہ تکلیف اس کی رہتی تھی کہ دوسرا زیادہ لے گیا ہے۔جب تک سب کے منہ کھل کر غار کا دہانہ بنے تو سب کچھ بٹ بٹا کے کھیل ختم ہو چکا تھا۔کھانے کو ایک کھیل تک مہیا نہ رہی۔اب چاروں طرف دہانے کھلے ہیں۔کیا کریں؟انہیں بھرنے کے لئے رشوت کے بازار میں گرم کرنے پڑے۔کھلے عام اشیائے خوردونوش اور دواؤں میں ملاوٹ ہونے لگی۔کوئی جرم ایسا نہیں جو انسان کے تصور میں آ سکے اور وہ یہاں پر واقعی ہو نہ رہا ہو۔ہندو تارکین وطن کی کروڑہا روپے کی مالیتی جائیدادیں پاکستان کو مفت حاصل ہوئیں۔اس سے پورا معاشرہ انتہائی حدوں تک متاثر ہوا۔اس میں کسی گروہ،قوم یا ذات کے لوگوں پر حرص و ہوس کے غلام بننے کا الزام نہیں اس دوڑ میں یہاں کے سب باسی سوائے چند غریب،پس ماندہ،جھینپو اور خاندانی بزرگوں کو چھوڑ کر شامل تھے۔پاکستان بننے کے پہلے چند مہینوں میں بلا استحقاق مفادات حاصل کرنے کی جو روایات وضع ہوئیں جو رنگ ڈھنگ اپنائے گئے وہ بدترین جرائم مثل جھوٹی دستاویزات بنانے،فریب اور دھوکہ دہی کو حصول مقصد کے لئے کام میں لانے سرکاری با اختیار افسران کو ساتھ ملا کر دریا دلی سے حصہ دینے اور پکڑ سے محفوظ رہنے کے طریقوں پر مبنی تھے اور آج بھی جاری ہیں۔

پاکستان پر یہ الزامات ہیں کہ ایک فیل شدہ ریاست ہے۔دنیا کی چند انتہائی کرپٹ ریاستوں میں اس کا شمار ہے۔اہم ترین ملکی ادارے آپس میں دست و گریبان ہیں جو حکومت وقت کی ناکامی کا واضح ثبوت ہے۔ڈبل

پالیسی اختیار کرنے کا الزام ہے کہ طالبان کے خلاف لڑ بھی رہے ہیں اور ان کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔حکومت کے احکامات کی تعمیل چند علاقوں تک محدود ہے۔معیشت کا اندازہ صرف ڈالر کے نرخ سے واضح ہو جائے گا۔جب پاکستان بنا تھا تو ڈالر اور روپیہ قیمت میں برابر تھے آج اگر بازار سے ایک ڈالر لینا ہو تو اس کے عوض آپ کو ایک سو سولہ روپے دینا ہونگے پاکستان تباہی اور بربادی کے گڑھے کنارے کھڑا گرنے کے لئے تیار ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ گھبرائیں نہیں۔پنجابی کہاوت ہے کہ ''زمین تے ڈھلے بیراں دا کجھ نیں وگڑیا پونجھ کے فیرٹوکری پالوؤ''

ترجمہ ''زمین پر گر گئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا پونچھ کر پھر ٹوکری میں رکھ لیں''

اسی کی مصداق پاکستان اگرچہ رنگا رنگ مصائب میں گھرا ہے لیکن جب تک اس کے باسی اس کو اپنا آخری سہارا سمجھتے ہیں اس کے بچ رہنے کی امید قائم ہے۔بیر مٹی پر گرے تو ضرور ہیں لیکن پونچھ کر پھر ٹوکری میں رکھ لیں۔ابھی ان کا بگڑا کچھ نہیں۔مرض قابل علاج ہے۔آپ یوں محسوس کریں جیسے محفوظ و آرام دہ بندرگاہ میں ایک 'پاکستان' نام کا جہاز لنگر انداز کھڑا ہے اور آپ اس میں بیٹھے ہیں۔سفر کو ابھی شروع ہونا ہے۔بہت بڑے اور کانٹے کے معرکے، وسائل کی کمی سے نہیں گھبراہٹ کی زیادتی سے ہاتھوں سے نکل جایا کرتے ہیں تقسیم پنجاب کی بدولت قتل و غارت کے مچائے اُدھم سے ہمارے ہاں سنجیدگی اور گھمبیرتا حصے سے زیادہ ہمارے گردو پیش اور ماحول میں در آئی ہیں۔ہنس نہیں سکتے تو کم از کم مسکراتے تو رہو۔وہ مصرع سنا تو ہوگا۔ع: چوں مرگ آید تبسم برلب اوست۔روتے مرو گے تو منہ قیامت تک بسورتا رہے گا۔مسکرانے کو غنیمت جانو۔اب تین چیزیں ہمارے کرنے کی ہیں وہ کر لیں نہیں تو سوائے پچھتاوے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔وہ اس عہد کا تقاضہ ہے اس کے مطابق اقوام عالم کے شانہ بشانہ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرو۔ہم پہلے ہی دوسروں سے پیچھے ہیں۔فرق اور بڑھا تو بچھڑ جائیں گے۔جو بچھڑ گیا وہ مر گیا۔چین ہم سے دو سال بعد آزاد ہوا سائنس اور صنعتکاری کے زور پر اس کے مالی حالات میں اس قدر استحکام آیا ہے کہ دنیا کی نمبر ایک طاقت امریکہ بھی اس سے قرض لیا کرتا ہے۔دوسری چیز یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کے ہر فرقے کے جوشیلے پیروکار موجود ہیں۔اس کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی موجود ہیں۔صرف اکثریتی فرقہ پورے پاکستان پر حکمرانی کر سکے یہ ناممکن ہے۔آپس میں نفرتیں بڑھتی رہیں گی اور پرتشدد نفاق کی صورتیں چہرہ دکھانے لگیں گی۔سیکولر انداز حکومت اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔چاروں صوبوں میں زبانیں مختلف بولی جاتی ہیں۔فریقین کے مابین بھائی چارے کی فضا اور حسن سلوک کا طریق اپنانا ملکی یک جہتی کے لئے از بس ضروری ہو گیا ہے۔وہ حالات وواقعات جو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کا باعث بنے ان میں بے انصافی اور وسائل کی غلط تقسیم اور متکبرانہ سلوک سرفہرست اسباب تھے۔انصاف، برابری اور باہمی خیرخواہی کی بنیاد پر حالات بہتر ہو سکیں گے ورنہ ملک ٹوٹ جائے گا۔اس کو بچالو وگرنہ ساتھ ہی میں اور آپ بھی مٹ کے رہ جائیں گے دوسروں کی عبرت کے لئے صرف ایک قصۂ پارینہ کے طور پر لوگ ہمیں دہرایا کریں گے۔

زندگی کے ادبی محاذ کے بارے میں راوی نے نئی نثری اور منظوم تخلیقات کے متعلق جو خبر مجھے دی ہے وہ بس اتنی ہے کہ ''سب اچھا ہے''۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح بنتی ہے کہ ''سویرا'' کا افسانہ نمبر جو سات سو صفحات سے متجاوز ہے ۲۰۱۸ء کے شروع میں آسمان ادب پر طلوع ہوا۔ ۲۰۱۷ء کی آخری سہ ماہی کے نواح میں کئی نئے ناول شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دو دہائیوں میں بالخصوص ترقی پسند تحریک ادب کے زاور پر افسانہ نویس کو بڑا عروج ملا اس زمانے کے مہان لکھنے والے منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ تھے۔ اس زمانے میں اگرچہ 'گئو دان' جیسا مشہور ناول لکھا گیا لیکن ناول نگاری سے کسی حد تک غفلت برتی گئی عمومی مقبولیت افسانے ہی کو حاصل رہی۔ ان دنوں ادب کا سہرا افسانے اور غزل کے سر بندھتا ہے اور نظم خاص طور پر نئی نظم شرماتی، لجاتی گھونگھٹ میں منہ چھپانے کی کوشش کرتی اور ساتھ ہی جلوہ نمائی کا شوق بھی رکھتی تھی۔ لیکن مزاج کی دونوں ضدین کو نبھاتی چلی آ رہی تھی۔ ناول کی صنف پچھلے کئی برسوں سے متواتر اپنا آپ کو منوانے پر مُصر ہے اور سابقہ کمی کی تلافی کرنے پر نہایت کامیابی سے کوشاں ہے۔ حال ہی میں جو چند ایک نئے ناول شائع ہوئے ہیں اور قارئین کی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں ان کے شائع ہونے کی تقدیم و تاخیر کو بھول جایئے۔ ان کے نام جیسے مجھے یاد آ رہے ہیں معہ مصنفین کے اسمائے گرامی کے بیان کرتا ہوں۔ کوئی نام اگر میرے برے حافظے کی نظر ہو گیا تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ناول کا نام	مصنف کا نام
جندر	اختر رضا سلیمی
طاؤس رنگ	نیلم بشیر
نیلی بار	طاہرہ اقبال
کوہِ گراں	خالد فتح محمد
گرد بار	عاطف علیم
چار درویش اور کچھوا	سید کاشف رضا

نظم کے میدان میں بھی کچھ نئی مطبوعات سامنے آئی ہیں۔

شاعری ہی کے حوالے سے عرض ہے کہ ناصر عباس نیر جو اردو ادب کے نقاد ہیں ان کی کتاب بہ عنوان ''نظم کیسے پڑھنی چاہیئے'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ میراجی کے بارے میں ایک کتاب شائع کر چکے ہیں۔ اب انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی طرح تنقید نگاری کے علاوہ اپنے افسانوں کے دو مجموعے ''خاک کی مہک'' اور ''فرشتہ آیا ہے'' شائع کئے ہیں۔ یہ چند خبریں جنہیں 'خوش خبریاں' کہنا چاہیئے۔ ان سے اردو ادب کے

دونوں نظم ونثر کے حصے بہت حوصلہ افزا صورت حال کی اطلاع بہم پہنچا رہے ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ کرۂ ارض کی وہ اقوام جو ٹیکنیکی، صنعتی اور سائنسی (علوم) کے لحاظ سے ترقی یافتہ صف میں اپنے لیے جگہ بنا سکی ہیں ان کے ہاں معاشی حالات مستحکم ہوتے ہیں ان کے ادیب، شعرا اور ماہرین فنون لطیفہ ہر لحاظ سے پر آسائش زندگیاں گزارتے ہیں۔ جہاں یہ صورت حالات ان کے لئے قابل فخر ہوتی ہے وہ ہمارے لئے رشک کا باعث ہی نہیں بعض صورتوں میں تو ندامت اور شرم کا سبب بن جاتی ہیں۔ علامہ اقبال روزگار کے لئے وکالت کرتے تھے اور فیض پہلے صحافت پھر اپنا پرانا پیشہ تعلیم وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔

لیکھک لکھتا رہتا ہے۔ غریب معاشرہ اسے اتنی اجرت بھی نہیں دیتا کہ وہ زندہ رہ سکے وہ شاید اس لئے لکھتا رہتا ہے کیوں کہ اس کے پاس دوسروں سے اپنے آپ کو مُمیّز کرنے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا یا شاید اس کے ذہن پر جذبات کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ اگر نہیں لکھے گا تو اس کی کھوپڑی کا ڈھکن اُڑ جائے گا۔ پورے ہندوستان میں شاعر اپنا کلام گلی گلی، گاؤں گاؤں گاتے پھرا کرتے تھے۔ معاشرہ انہیں دو وقت کی روٹی اور پہننے کو کپڑا لتا دیتا تھا۔ شاعر اور گویّے مفت شعر سناتے یا گائیکی کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ ہمارا معاشرہ شاید آج بھی اپنے ادیبوں اور شعرا سے یہی توقع رکھتا ہے جبکہ زمانہ بدل چکا ہے۔

جہاں معاشی استحکام ہوتا ہے وہاں ادب کی پیداوار تعدّد اور اوصاف خصائل کے لحاظ سے قابل تحسین ٹھہرتی ہیں۔ نوبل انعام بھی گاہے گاہے اس کی تصدیق کرتا رہتا ہے۔ وہ اقوام جو صنعتی لحاظ سے پس ماندہ اور معاشی لحاظ سے متزلزل رہتی ہیں ان کی آبادی کا بیشتر حصہ خطِ غربت سے اپنے آپ کو اونچا رکھنے کے ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ وہاں کے ادیبوں اور شعرا کو اپنی روز کی دال روٹی کمانے کے لئے اپنے فن کے علاوہ دوسرے محنت ومشقت کے ذرائع بروئے کار لانے پڑتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کی انفرادی طور پر انہیں کامیابی کہاں تک ملتی ہے ان غریب ممالک میں فن اور فنکار کا انجام یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ آخر کو دال روٹی انہیں اور ان کے فن دونوں کو کھا جاتی ہے۔

☆☆☆